ڈاکٹر منیر گجر
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اردو اور مشرقی زبانیں، یونی ورسٹی آف سرگودھا
ڈاکٹر عمران ازفر
لیکچرر
شعبۂ اردو اور مشرقی زبانیں، یونی ورسٹی آف سرگودھا

قصہ ہیر رانجھا کے فارسی شعرا کا تقابلی جائزہ

ABSTRACT

By Dr. Munir Gujjar, Assistant Professor, Department of Urdu and Oriental languages, University of Sargodha.
Dr. Imran Azfar, Lecturer, Department of Urdu and Oriental languages, University of Sargodha.

The love tale of Heer and Ranjha has been indisputably the much loved tale of Punjabis through all the times since its inception. Persian was a language of great intellectual worth and the state language of sub-continent as well when this tale emerged and got fame. Some of the Persian poets, who travelled with the invaders coming from West, translated popular folks and tales of Punjabi in Persian poem. Using their own language as a medium and embracing the indigenous tales was a laudable effort. By this way, they earned a quick response from the locals and inspired many local poets to write this tale in Persian. This article is a brief introduction to poets who ventured this tale in Persian along with a comparative analysis of the tale, the characters and chronological order of the happenings.

تاریخ کے دائروی چکر پر نگاہ کی جائے تو پنجاب شروع ہی سے مغرب کی طرف سے وارد ہونے والے حملہ آوروں کی گزرگاہ رہا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز کسی نہ کسی صورت جاری وساری ہے اور معاشی جنگ ہو یا فاتح اور مفتوح کی نفسیات کی جانچ اس خطے کی دلچسپ نفسیات کئی حوالوں سے مطالعے کا تقاضا کرتی ہے۔ معلوم تاریخ کے مطابق سبکتگین پہلا تُرک مسلمان تھا جس نے شمال مغرب کی جانب سے ہندوستان پر چڑھائی کی۔ بعد میں اس کے بیٹے محمود نے یکے بعد دیگرے ان حملوں کو عروج دیا۔ محمود نے ۱۰۰۰ء سے ۱۰۲۶ء کے درمیان ہندوستان پر سترہ حملے کیے جن کا منطقی نتیجہ سومنات کی فتح کی صورت سامنے آیا۔ غزنویوں کے پہ در پہ حملوں کے بعد غوریوں کی باری آئی۔ مورخین کی عمومی رائے کے مطابق یہ غزنویوں کی طرح جنگجو یا ظالم نہیں تھے۔ ان کا مقصد پنجاب یا ہندوستان میں تُرک سلطنت کا قیام تھا۔ انھوں نے اپنے حملوں کے دوران غزنویوں کی طرح

جان و مال کی سطح پر زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ ایک جنگ سے واپسی پر ۱۲۰۶ء میں شہاب الدین غوری ایک مقامی پنجابی کے ہاتھوں جاں بحق ہوا تو سپہ سالاری قطب الدین ایبک کے حصے میں آئی۔

چنگیز خان کی سربراہی میں وسط ایشیا سے اُٹھے منگول آندھی کی طرح روس، ایران اور افغانستان پر چھا گئے۔ ۱۲۲۱ء میں خوارزم کے شہزادے جلال الدین کا تعاقب کرتے ہوئے چنگیز خان دریائے اٹک کے کنارے تک آیا تو منگولوں نے ہندوستان کا راستہ دیکھا۔ اس کے بعد کے ڈھائی سو سال پنجاب ایک بار پھر حملہ آوروں کی زد میں آیا اور ایسا زد میں آیا کہ ہر طرف تباہی و بربادی پھیل گئی۔ تیمور نے دہلی کے لوگوں کے خون سے وہ ہولی کھیلی جس کی نظیر انسانی تاریخ میں ڈھونڈنا مشکل ہے۔ بابر کے آنے سے حالات کچھ سنبھلے اور حملہ آوروں کی مستقل آمد میں کچھ وقفہ آیا۔ یوں اس سارے عمل سے ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی جو اٹھارویں صدی تک کسی نہ کسی صورت اپنا وجود برقرار رکھتی ہے۔ ان حملہ آوروں کے ساتھ ٹکر لینے والے دہلی کے سلاطین میں سے بلبن اور علاؤ الدین کے نام نمایاں ہیں لیکن اس کام کے لیے حکمرانوں کو بڑی بڑی فوجیں رکھنا پڑیں۔ یہ فوجیں زیادہ تر پنجاب میں ہی تھیں۔ یوں لگ بھگ پنجاب کا ہر بڑا شہر فوجی چھاونی بن گیا۔ ان فوجوں کا سارا خرچہ بھی پنجاب کو ہی برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں آمد و رفت کے وسائل آج جیسے نہ تھے اور اناج کو دور دراز کی منڈیوں میں لے جانا بہت مشکل تھا۔ ہر بڑے شہر میں قلعے بن جانے سے اناج کی قلت ہوئی جس کے نتیجے پانچ دریاؤں کی اس سرزمین پر مہنگائی میں اضافہ ہوا۔

ان نئے حالات میں نئی سرکار کی طرف سے خطہِ پنجاب کے باسیوں کو سرکار کی جانب سے فارسی زبان اپنانے کا حکم ملا۔ گزشتہ طویل عرصہ سے لگ بھگ ان سبھی حملہ آوروں کی زبان فارسی تھی جنھوں نے اس خطہ زمین کو اپنی نوک سناں کا تجربہ بنایا۔ یوں جہاں فارسی دربار سرکار کی زبان بنی وہیں اس نے مقامی آبادیوں کی محبوب زبان پنجابی پر بھی اثر ڈالا۔ فوجا سنگھ لکھتے ہیں:

> One great consequence of Mahmud's invasion of India was that a new linguistic relationship took birth between Iran and India, with the result that Punjabi gracefully accepted the impact of the Persian language and Persian poetry, and both the languages started acquiring a new status.(1)

فوجا سنگھ بتاتے ہیں کہ ہندوستان کی سرزمین پر محمود کا اصل کارنامہ ہندوستان اور ایران کی زبانوں کے درمیان لسانیاتی روابط کا قیام ہے جس میں پنجابی نے بڑی شان کے ساتھ فارسی زبان اور فارسی شاعری کے اثرات قبول کیے جس کے باعث دونوں زبانوں نے نئے احساس کو اپنے کلی مزاج کا حصہ بنایا جس نے آگے چل کر اس خطے کے تخلیقی مزاج کو خاصی حد تک متاثر کیا۔

ایک تو حکمران طبقے کی زبان ہونے کی وجہ سے اور دوسرا مسلمانوں کے اس زبان (فارسی) کے ساتھ گہرے مذہبی اور تاریخی روابط کی وجہ سے یہ نووارد زبان خطہ پنجاب کے انفرادی اور اجتماعی رویوں پر بہت جلد اثر انداز ہوئی۔اس فوری اثر کے سبب قومی اور ملی سطح پر بہت سا ادب فارسی میں تخلیق کیا گیا۔ اس نئے تخلیقی رجحان کی وجہ سے فارسی شعراء کا دھیان مقامی دانش کی نمائندہ لوک داستانوں کی طرف بھی گیا اور ان تخلیق کاروں نے پنجابی قصوں کو نئی رواج پاتی فارسی زبان میں لکھنا شروع کیا۔ پنجاب کے لگ بھگ سبھی لوک قصے جیسے ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی مہینوال اور مرزا صاحباں فارسی میں کے تخلیقی استعارے میں ڈھالے گئے۔اس نئے منظر نامے میں سب سے زیادہ جو قصہ فارسی شعراء کی توجہ کا مرکز بنا وہ پنجاب کی لوک داستان ہیر رانجھا کی رومانوی کہانی ہے۔اب تک لگ بھگ اٹھارہ شعراء نے اس کہانی کو فارسی میں شعری قالب میں منتقل کیا۔ ان میں سے کئی شعراء ایسے ہیں جو ان حملہ آوروں کے ساتھ یا ان کے بنائے راستوں پر چل کر یہاں آئے اور کچھ یہاں کے مقامی شعراء تھے جنھوں نے فارسی زبان کو تخلیقی عمل کے لیے ذریعہِ اظہار بنایا۔باقی کولابی جو مقامی تو نہ ہے مگر اس سلسلے کا پہلا تخلیق کار ہے جس نے فارسی زبان کی قوت کو اظہار کا وسیلہ بنایا اور ہیر رانجھا کے قصے کو فارسی زبان میں منتقل کیا۔

باقی کولابی

یہ بخارہ کے جنوب میں ایک گاؤں کولاب کا رہنے والا تھا۔عہدِ اکبری میں ہندوستان رہا اور ۱۵۷۹ء میں جونپور میں معصوم خان کابلی کی بغاوت کے وقت مارا گیا۔[۲] اس نے ''مثنوی ہیر و رانجھا'' لکھی۔ اسی مثنوی سے ہی اس کا مکمل نام حیات جان سامنے آتا ہے۔باقی کے مالی حالات کچھ اچھے نہیں تھے لیکن اسے اپنی شعری خوبیوں پر بہت فخر تھا۔اس بات کی گواہی اس کے شعروں سے ملتی ہے۔

باقی نے ہیر رانجھے کا قصہ کب نظمایا،اس بارے میں کوئی حتمی تاریخ متعین نہیں ہوسکی لیکن اس کے کلام میں سے ملے اشاروں سے ۱۵۷۵ء اور ۱۵۷۹ء کا درمیانی عرصہ اس کا قصۂ ہیر لکھنے کا عرصہ کہا جاتا ہے۔ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں:

> ''مولانا باقی کی ''مثنوی ہیر رانجھا'' کی صحیح تاریخِ تصنیف معین کرنا ممکن نہیں۔ التبہ شواہد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا سنِ تصنیف ۹۸۳ھ (۱۵۷۵م)اور ۹۸۷ھ (۱۵۷۹م) کے بین بین ہے۔لیکن یہ بھی صرف ایک قیاس ہے۔شاعر اکبر کی حدودِ سلطنت کا ذکر اس انداز سے کرتا ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ وہ بنگال فتح کر چکا تھا۔اور یہ ۹۸۳ھ (۱۵۷۵م) کا واقعہ ہے۔لیکن چونکہ مولانا خود ۹۸۷ھ (۱۵۷۹م) کے بعد بقیدِ حیات نہ تھے اس لیے یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ مثنوی اس سے پہلے ہی اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا اس کی تاریخِ تصنیف ۹۸۳ھ (۱۵۷۵م) اور ۹۸۷ھ (۱۵۷۹م) کے بین بین قرار پائی۔''[۳]

باقی نے قصے کا آغاز حمد سے کیا ہے اور بعد میں نعتِ نبی ﷺ اور واقعہ معراج کے بارے میں بھی ایک مثنوی لکھی ہے۔اس کے بعد اپنے مرشد پیر عبداللہ شاہ نقشبندی کا قصیدہ لکھا ہے۔عبداللہ شاہ نقشبندی بھی باقی کی طرح بخارہ سے ہندوستان آئے تھے۔اپنے قصے میں باقی نے شہنشاہ اکبر کی بہت تعریف کی ہے اور اسے شاہِ عادل کہا ہے:

گفتم من ناتواں بی دل　　ایں نامہ بنام شاہ عادل
چوں ملک شدہ زعدلش آباد　　عالم ھمہ در نگین اوباد(۴)

باقی نے رانجھے کا نام دیدو بتایا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ مزاجاً عشق پسند تھا۔عشق اس کے مزاج میں یوں رچا ہوا تھا کہ ہیر کے حسن کی صرف تعریف سُن کر ہی اس پر عاشق ہو چکا تھا۔ماں کے روکنے پر بھی نہیں رکتا اور ہیر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔راستے میں اسے پانچ پیر ملتے ہیں۔پیروں کے پاس ایک ایسی بھینس ہوتی ہے جو دودھ دینے سے قاصر ہوتی ہے۔پیر اسے بھینس کا دودھ دوہنے کا کہتے ہیں۔خدا کی قدرت کہ بھینس دودھ دے دیتی ہے۔پیر سمجھ جاتے ہیں کہ یہ بھی کوئی درویش ہے۔وہ خوش ہو کر اسے دعائیں دیتے ہیں۔

ہیر کا باپ چوچک بہت سخی زمیندار تھا۔وہ رانجھے کو نوکر رکھ لیتا ہے۔شہر میں دھیدو کے حسن کی دھوم مچی تو ہیر بھی اسے دیکھنے آئی اور دیکھتے ہی دل ہار بیٹھی۔ایک دایا کو وسیلہ بنا کر میل ملاقات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔آہستہ آہستہ عشق کی بات مشہور ہو جاتی ہے۔ہیر کے والدین اس کی شادی حسام نامی شخص سے کر دیتے ہیں اور دھیدو بھی بارات کے ساتھ جہیز کا سامان چھوڑنے جاتا ہے۔سہاگ کی رات ہیر حسام کی خوب پٹائی کرتی ہے اور میکے آجاتی ہے۔حسام اسے لینے آتا ہے تو ہیر صاف انکار کر دیتی ہے اور کہتی ہے کہ میں رانجھے کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔حسام یہ سن کر روتا پیٹتا شاہِ عادل کے دربار پہنچ جاتا ہے۔ہیر کو دربار میں بلایا گیا۔مفتیوں اور قاضیوں نے شرع کے مسئلے بیان کیے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔قاضی نے زبردستی ہیر کو حسام کے حوالے کر دیا۔سُسرال پہنچتے ہی ہیر بیمار پڑ گئی۔رانجھا جوگی کے روپ میں وہاں پہنچا اور حکمت شروع کر دی۔پھر سے چوری چھپے ملنے کا سلسلہ چلا تو دونوں نے گھر سے فرار ہو کر ملنے کے لیے مقام کا تعین بھی کر لیا۔ہیر نے گھر آ کر اپنے شوہر سے پیار کا ڈھونگ رچایا اور اسے شیشے میں اتار کر میکے جانے کی اجازت لے لی۔گھر آ کر اس نے رانجھے کے ساتھ جانے کے لیے ماں کی بہت منت سماجت کی لیکن ماں نہ مانی۔بالآخر ایک دن موقع پا کر ہیر گھر سے نکلی اور رانجھے کے پاس پہنچ گئی۔دونوں آبادی سے بچتے بچاتے ویرانے میں نکل گئے۔کچھ عرصے بعد کسی بیماری کی وجہ سے رانجھا راہیِ اجل ہوا اور ہیر نے بھی موت کے لیے دعا مانگی۔اس کی دعا قبول ہوئی۔زمین پھٹی اور ہیر اس میں سما گئی۔

باقی نے قصے میں کچھ تبدیلیاں بھی کیں۔اس نے ہیر اور رانجھے کی پہلی ملاقات دوسرے شعراء سے بالکل مختلف بیان کی ہے۔رانجھا جھنگ پہنچ کر ہیر کے باپ کے ہاں نوکر ہو جاتا ہے۔اس کے حسن کی دھوم سن کر دوسرے لوگوں کی طرح ہیر بھی اس کے حسن کا چرچا سن کر اسے دیکھنے آتی ہے اور اس پر فِدا ہو جاتی ہے۔باقی نے سیدے کھیڑے کا نام بدل کر حسام کر دیا۔شادی کے بعد جب ہیر کسی طور گھر بسانے کے لیے راضی نہیں ہوتی تو حسام اس کی شکایت لے کر 'شاہِ عادل' کے دربار

میں پیش ہوتا ہے۔ یوں باقی نے قصے کا زمانی تعلق اکبر سے جوڑ دیا حالانکہ ہیر کا ذکر عہدِ اکبری سے پہلے بھی ملتا ہے۔ آج تک کی تحقیق کے مطابق ہیر کا ذکر سب سے پہلے ''مقاماتِ داؤدی'' میں ملتا ہے۔ حضرت مخدوم شاہ داؤد کرمانی کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے میاں رانجھا اور مائی ہیر کا تذکرہ کیا۔ حضرت صاحب نے فرمایا کہ آپ نے نیک لوگوں کا ذکر کیا ہے اللہ پاک آپ کی آئندہ پانچ نسلوں پر رحم کرے گا۔(۵) یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ حضرت مخدوم داؤد کرمانی مغل بادشاہ ہمایوں (۱۵۳۰ء-۱۵۵۶ء) کے عہد میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔(۶) یوں باقی کا ہیر کو عہدِ اکبری میں زندہ بتانا درست نہیں ہے۔ باقی نے قصہ کے کرداروں کے مزاج میں موقع پرستی دکھائی ہے۔ مثال کے طور پر جب حسام کی آہ و بکا سن کر قاضی ہیر کو اس کے حوالے کر دیتا ہے تو ہیر اس کے ساتھ پیار کا ڈھونگ رچا کر اپنا مطلب نکالتی ہے۔

سعید سعیدی

سعید سعیدی نے ''افسانہ ءِ دلپذیر'' کے عنوان سے ہیر رانجھے کی عشق کہانی کو نظم کیا۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق وہ شاہجہاں کے دور (۱۶۲۸ء-۱۶۵۸ء) میں ہوا۔ اس نے قصے کے شروع میں شاہجہاں کی مدح سرائی بھی کی ہے۔ سعید سعیدی کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا؟ اس نے ہیر رانجھے کا قصہ کب نظم کیا، اس بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتیں۔ اس کی شاعری سے ہی پتا چلتا ہے کہ اس کا نام سعید اور تخلص سعیدی تھا۔ کہیں کہیں سعید جامی بھی لکھا ملتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ دونوں اس کے تخلص ہوں۔ اس نے اپنے قصے میں دو تین دعوے کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ قصہ ہیر کا خالق ہے اور اسی کی وجہ سے کہ داستان عالمی شہرت کی حامل ٹھہری:

خوباں جہاں فسانہ ھستند — رسوا شدۂ زمانہ ھستند
مشہور زمانہ داستانند — خوباں ہمہ شہرۂ جہانند
افسانۂ ہیر کس نگفتہ است — ایں در کسی نہفتہ است
برخیز ہمیں سخن بیان کن — افسانۂ ہیر داستان کن
آں بکر جمیلہ بود مستور — اکنوں شد ایں فسانہ مشہور(۷)

دوسرا دعویٰ اس نے یہ کیا کہ یہ قصہ اس کا طبع زاد ہے، اس نے کسی سے سن کر نہیں نظمایا:

ایں گفت وشنود زادۂ طبع
ہر نکتہ بدل نہادۂ طبع(۸)

سعیدی نے بھی حمد سے قصے کا آغاز کیا ہے۔ اس کے بعد نعت اور نعت کے بعد بادشاہ کا قصیدہ لکھا ہے۔ رانجھے کے حسن کی تعریف کی ہے اور اسے یوسفِ ثانی کہا ہے۔ سعیدی نے رانجھے کا نام دھید ولکھا ہے۔ دھید و بارے طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ ایک دن کسی لگائی بجھائی کرنے والے نے اس کے بھائیوں کے کان بھرے کہ تمھارا بھائی تو عشق میں دیوانہ

ہوا پھرتا ہے اور تمھیں خبر ہی نہیں؟ بھائیوں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ سفر میں اسے حضرتِ خِضر اور ان کے ساتھی مل جاتے ہیں۔ رانجھا انھیں گائے کا دودھ پیش کرتا ہے۔ بزرگ خوش ہو کر اسے ہیر عطا کر دیتے ہیں۔

ہیر اور رانجھا پہلی ملاقات میں ہی ایک دوسرے کو دل دے بیٹھتے ہیں۔ ہیر اسے ساتھ لے جاتی ہے اور اپنے باپ کے ہاں ملازم رکھوا دیتی ہے۔ پھر قصے میں کیدو کی آمد ہوتی ہے اور عشق کی بات زبانِ زدِ عام ہو جاتی ہے۔ ہیر کے والدین اس کا بیاہ اجو کے بیٹے سدر سے کر دیتے ہیں۔ جہیز کی بھینسوں کو ہیر کے سُسرال پہنچانے کا کام رانجھے کے سپُرد ہوا۔ وہ بھینسیں پہنچاتا ہے اور انعام و اکرام لے کر واپس آ جاتا ہے۔ ہیر اپنی نند سہتی کو ہمراز بنا کر رانجھے کو خط بھیجتی ہے۔ رانجھا فقیر بن کر آ جاتا ہے۔ سہتی ہیر کے پاؤں پر لکڑی سے ضرب لگا کر سانپ ڈسنے کا واویلا کرتی ہے اور رانجھا علاج کرنے آتا ہے اور ہیر کو ساتھ لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ سدر اس کا تعاقب کر کے اسے پکڑ لیتا ہے اور قاضی کے پاس لے جاتا ہے۔ قاضی پہلے تو کھیڑوں کے حق میں فیصلہ کرتا ہے لیکن ہیر یہ فیصلہ سن کر کپڑے پھاڑ لیتی ہے، رونا شروع کر دیتی ہے اور قاضی کو بد دعائیں دیتی ہے۔ قاضی فیصلہ بدل لیتا ہے اور ہیر کو رانجھے کے حوالے کر دیتا ہے۔ کھیڑے واپس آ کر ہیر کے باپ کو بذریعہ خط ساری صورتحال سے آگاہ کر دیتے ہیں۔ ہیر اور رانجھا ایک سال قاضی کے شہر میں گزارتے ہیں۔ پھر رانجھا بیمار ہو کر مر جاتا ہے۔ ہیر اس کی جدائی برداشت نہ کر سکی اور وہ بھی چل بسی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے قریب دفن کر دیا جاتا ہے۔

سعیدی نے دعویٰ تو کیا ہے کہ یہ قصہ اس کی ایجاد ہے لیکن کافی حد تک اس کا پلاٹ باقی کولابی کے قصے والا ہی ہے۔ واقعات میں کمی بیشی دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر سعیدی کے قصے میں ہیر اور رانجھا ہیر کی شادی سے پہلے دو دفعہ بھاگنے کو کوشش کرتے ہیں لیکن دونوں بار ہیر کے بھائی اسے واپس لے آتے ہیں۔ باقی نے یہ نہیں بتایا کہ رانجھے نے دریا کیسے پار کیا جبکہ سعیدی اس کے دریا پار کرنے کا جو منظر بیان کرتا ہے وہ لگ بھگ وہی ہے جو وارث شاہ نے بیان کیا ہے۔ سعیدی کے بقول بھی لُدن (لُڈن) کی دونوں بیویاں رانجھے کی بانسری سن کر اس پر فدا ہو جاتی ہیں اور لُدن سے کہتی ہیں کہ کشتی رانجھے کے پاس لے چل۔ باقی نے ہیر اور رانجھے کی ملاقات کے لیے دایا کے کردار کو وسیلہ بنایا تھا جبکہ سعیدی نے دونوں کو بغیر کسی وسیلے کے ملایا ہے۔ سعیدی نے قصے میں ایک منفرد بات کی ہے کہ اس نے ہیر اور رانجھے کے ملاپ کے بعد رانجھے کی موت کی بات کی ہے۔ یہ موت بھلے ملاپ کے ایک سال بعد ہوئی لیکن اس سے قصے کا انجام دکھانت ہو گیا۔

میتا چنابی

میتا چنابی اصلاً پنجابی تھا اور اسے پنجابی ہونے پر فخر بھی تھا۔ اس نے فارسی میں ''قصہ ہیر و ماہی یا عشقیہ پنجاب'' کے عنوان سے یہ قصہ لکھا۔ یہ کلاس کے ضلع گوجرانوالا کا رہائشی تھا۔ شاہجہانی دور میں اس کا باپ حکمت کی وجہ سے مشہور تھا۔ میتا بھی حکیم تھا اور شاعری کو صرف فارغ وقت کے مشغلے کے طور پر دیکھتا تھا۔ اس نے قصے میں اپنا اصل نام میتا پسر حکیم درویش اور تخلص چنابی بتایا ہے جو دریائے چناب کی نسبت سے ہے۔ فارسی شعر ریت میں میتا کو درمیانے درجے کا شاعر مانا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ظہور الدین احمد ''تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند'' میں اس کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''ہم نے یہاں جن مثنوی نگار شعراء کے نام لیے ہیں، ان میں علی احمد نشانی، محمد معصوم نامی، سعید سعیدی، محمد رضا رضائی، محمد مراد لایق، میتا چناں یقیناً درمیانے درجے کے شاعر ہیں۔''(۹)

میتا کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ وہ سُنی العقیدہ مسلمان تھا اور اسے نبی ﷺ اور خلفاءِ راشدین سے عشق تھا۔ قصہ لکھنے کا سال فارسی شعریت کے مطابق شعر میں ہی بیان کیا ہے:

تاریخ دعا ست بہر ایں باغ
'بد' دور چنابی از ''چنین باغ''(۱۰)

ڈاکٹر باقر نے اس شعر میں سے تاریخ یوں متعین کی ہے:

''اگر ''چنین باغ'' کے اعداد سے 'بد' کے اعداد خارج کریں تو ۱۱۱۰ ھ برآمد ہوتا ہے۔''(۱۱)

یعنی میتا چنابی نے یہ قصہ ۱۶۹۸ء میں تمام کیا۔ اس وقت یہ عمر کے آخری حصے میں تھے۔ اس بات کی گواہی اس شعر سے ملتی ہے:

خمیدہ پشت زپیری خود چنابی نیست
بخاک کوي تو گم کردہ عمر می جوید(۱۲)

چنابی نے قصہ کوٹ کمالیہ میں مکمل کیا۔ اس وقت کمالیہ کا رئیس محبت خان کھرل تھا جو عالم گیر کے دربار کا منشی بھی تھا۔ اس نے یہ قصہ بہت پسند کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سیالوں اور کھرلوں میں شروع سے ہی ٹھنی ہوئی تھی۔ ''جھنگ کی لوک کہانیاں'' کے لکھاری بلال زبیری نے شاید اسی بات کو بنیاد بنا کر کہا تھا کہ یہ قصہ سیالوں کو بدنام کرنے کے لیے محبت خان کھرل نے شروع کروایا تھا۔(۱۳) میتا کے تاریخ بتانے سے ہی بلال زبیری کی یہ بات غلط ثابت ہو جاتی ہے، کیوں کہ اس سے بہت پہلے پنجابی میں دمودر اور فارسی میں باقی کولابی اور سعید سعیدی یہ قصہ لکھ چکے تھے۔

میتا چنابی کو پنجابی کے پہلے شاعر اور درویش بابا فرید سے بھی حد درجہ عقیدت تھی۔ اپنے کلام میں اس نے اس عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

مرجع بہ طعم دگر سخن سنج — شہرہ بہ مریدی شکر گنج
او مرشد و من مرید اویم — بل بندۂ زرخرید اویم
مدحش کہ سعادت مرید است — گنجی است زبان من کلید است(۱۴)

چنابی کے ہاں بھی قصے کا اختتام دکھانت ہے۔ رانجھا کسی بیماری کی وجہ سے گزر جاتا ہے اور ہیر اس کی وفات کی خبر سن کر چل بستی ہے۔ چنابی نے نیا دعویٰ بھی کیا ہے کہ رانجھا مرنے کے بعد شاعر کے گاؤں کلاس میں دفن ہوا:

در دیہہ ''کلاس'' نام آنجای

کردند مزار آں دل آر ای(۱۵)

ہیر جو کہ رانجھے کے مرنے کی خبر سن کر راہیِ عدم ہوئی تھی، اپنے آبائی گاؤں چوچکانہ میں دفن ہوئی لیکن بعد میں اس نے اس وقت کے حاکم کے خواب میں آ کر کہا کہ اسے جھنگ کے جنوب میں دفن کیا جائے۔ ایسا ہی ہوا اور اسے تابوت میں ڈال کر وہاں دفنایا گیا جہاں اب ہیر کا مزار ہے۔

فقیر الدین آفرین لاہوری

فقیر الدین آفرین لاہور کے رہنے والے اور ذات کے گجر تھے۔ ''تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند'' میں ان کے بارے کچھ یوں لکھا ہوا ہے:

> ''نسباً جو یہ گوجر تھے (سید ہونے کی روایت بھی ہے)۔ لاہور کے محلہ بخارائی میں سکونت پذیر رہے۔ جید عالم ہونے کے علاوہ علمِ رمل بھی جانتے تھے۔ درویش مشرب تھے۔ امراء سے استغنا کا اظہار کرتے مگر فقراء اور غرباء سے تواضع سے پیش آتے تھے۔ ان کی خوش خلقی اور خوش مشربی کا ہر ایک معترف تھا۔''(۱۶)

آفرین شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ ساری عمر لاہور میں ہی گزاری اور کبھی لاہور سے باہر نہ گئے۔ ۱۱۵۴ھ (۱۷۴۱ء) میں وفات پائی اور لاہور میں ہی دفن ہوئے۔(۱۷) انھوں نے ''ابجد فکر''، ''مہتاب و کنان یا جان و دل'' اور ''ناز و نیاز'' کے عنوانات سے تین مثنویاں لکھیں۔ ''ناز و نیاز'' تیسری اور سب سے اہم مثنوی ہے جس میں ہیر اور رانجھے کا قصہ نظمایا ہے۔ یہ فرخ سیّر کے زمانے (۱۱۲۵ھ-۱۱۳۱ھ) میں لکھی گئی۔(۱۸)

ڈاکٹر محمد باقر اس بارے میں لکھتے ہیں:

> ''چونکہ فرخ سیر ۱۱۳۱ق میں فوت ہو گیا تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی اس سے پہلے نظم ہوئی تھی۔ آفرین کے شاگرد حکیم بیگ خان حاکم لاہوری نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے کہ آفرین نے ہیر رانجھا فرخ سیر کے عہد میں لکھی ہے۔ اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ مثنوی بہرصورت فرخ سیر کے عہد کے اختتام ۱۱۳۱ق / ۱۷۱۳م سے پہلے مکمل ہو چکی تھی۔''(۱۹)

آفرین کے بقول رانجھا ہزارہ کے رئیس معزی کے چار بیٹوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ وہ سر پھرا نوجوان تھا

اور اسے آتے جاتے مسافروں سے دوسرے شہروں کے قصے سُننے کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ ایک مسافر نے اس کے سامنے ہیر کے حسن کی تعریف کی:

پریزاد دختی گرامی نژاد — حیا بندۂ عصمتش خانہ زاد
بتی رنگ بتخانۂ چیں شکن — شکر آب کن قدر شیریں شکن
بہر عضو شمع مرصع لگن — بہار تجلی چمن در چمن
طلسمی است آں سینۂ دلپذیر — صفا را نمک ریختہ در ضمیر
حیا را دگر سنگ برشیشہ است — شکم جای او پای اندیشہ است
بو دہیر نام آں پریزاد چہر — وفا مادر آورد ھمزاد مہر (۲۰)

ہیر کے حسن کی بابت سن کر رانجھا اس پر عاشق ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب رانجھے کا باپ فوت ہو گیا تو وہ ہیر کی تلاش میں نکل پڑا۔ پہلی ملاقات میں ہی ہیر اور رانجھے نے ایک دوسرے سے پیار نبھانے کا عہد کر لیا۔ ہیر نے باپ سے سفارش کر کے اسے نوکر رکھوا لیا اور وہ بھینسوں کی دیکھ بھال پر معمور ہوا۔ ان کے پیار کا چرچا عام ہوا تو ہیر کے والدین نے رنگ پور کے رہائشی نورنگ سے اس کی منگنی کر دی۔ دوسری طرف رانجھا جو عشق کا چرچا ہونے پر شہر چھوڑ آیا تھا اور جنگلوں میں مارا مارا پھرتا تھا، اس کی ملاقات پانچ پیروں سے ہو جاتی ہے۔ رانجھا انھیں دودھ پلاتا ہے اور وہ خوش ہو کر اسے دعائیں دیتے ہیں۔ رانجھا واپس آ جاتا ہے اور دوبارہ ہیر سے ملاقاتوں کا سلسلہ بحال کر لیتا ہے۔ ایک دن ہیر کے بھائیوں نے دونوں کو اکٹھا دیکھ کر قتل کے ارادے سے رانجھے پر حملہ کر دیا لیکن ان کی تلواریں چل ہی نہ سکیں کیوں کہ رانجھے کے ساتھ پانچ پیروں کی دعائیں تھیں۔ اس واقعہ کے بعد انھوں نے ہیر کی شادی میں عجلت کی۔ نکاح کے موقع پر ہیر نے قاضی سے بہت بحث کی اور اسے لاجواب کر دیا لیکن اس کے باوجود اسے زبردستی ڈولی میں بٹھا دیا گیا۔ رانجھا بھی جہیز کی بھینسوں کو چھوڑنے ساتھ گیا کیوں کہ بھینسیں کسی اور کے قابو نہیں آ رہی تھیں۔ ہیر نے جدائی سے تنگ آ کر چٹھی لکھی اور رانجھا جوگی کا روپ دھار کر پہنچ گیا۔ ہیر نے پاؤں پر لکڑی سے ضرب لگا کر سانپ کے ڈسنے کا شور مچا دیا۔ رانجھا علاج کرنے آیا اور چند دن بعد ہیر کو بھگا لے گیا۔ ابھی وہ تھوڑا دور ہی گئے تھے کہ پکڑے گئے۔ ہیر کے والدین کو بھی بلا لیا گیا۔ پہلے تو انھوں نے رانجھے کو جان سے مارنے کا ارادہ کیا لیکن ہیر کی ماں کے روکنے پر ایسا کرنے سے باز رہے۔ بالآخر معاملے کو قاضی کے پاس لے جانے پر سب متفق ہو گئے۔ قاضی نے اولاً تو ہیر کو کھیڑوں کے سپرد کیا لیکن پھر ہیر کے رونے اور واویلا کرنے پر اسے رانجھے کے حوالے کر دیا۔ ہیر کے میکے والے اور سُسرال والے دونوں اس فیصلے سے خوش نہیں تھے لہٰذا انھوں نے زبردستی دونوں کو الگ کیا اور رانجھے کو شہر سے دور ایک ویرانے میں پھینک آئے۔ ہیر پر بہت سختیاں کی گئیں لیکن اس نے رانجھے کا خیال دل سے نہ نکالا۔ بالآخر گھر والوں کو اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے اور اسے رانجھے کے پاس پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد ہیر اور رانجھا کچھ عرصہ زندہ رہے اور پھر

وفات پا گئے۔

آفرین کی کہانی وارث شاہ سے بہت ملتی جلتی ہے۔ وارث شاہ کا ہیر لکھنے کا زمانہ آفرین کے بعد کا ہے۔ ہیر رانجھے کا قصہ پنجاب میں دن بدن مقبول ہو رہا تھا اور اسی مقبولیت کی وجہ سے کہانی میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ مسلسل تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔آفرین کی کہانی سے یہ بات بھی اخذ کی جاسکتی ہے کہ اس وقت عوامی سطح پر ہیر اور رانجھے کی کہانی کی یہ صورت مقبول تھی۔اس کہانی کے عوامی سطح پر مقبول ہونے کا ایک ثبوت تو وارث شاہ کے اس مصرعے سے بھی ملتا ہے جس میں اس نے یہ قصہ نظم کرنے کی وجہ بیان کی ہے:

حکم من کے سجناں پیار یاں دا، قصہ عجب بہار دا جوڑ یائے[۲۱]

احمد یار خان یکتا خوشابی

احمد یار خان یکتا خوشابی جو کہ یکتا خوشابی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، بارھویں صدی کے اہم شاعر ہیں۔ان کے آباء و اجداد بابر کے دور میں ترکستان سے ہجرت کر کے برِعظیم آئے اور خوشاب میں سکونت پذیر ہوئے۔ان کا تعلق برلاس قبیلے سے ہے۔

ان کے والد اللہ یار خان اورنگ زیب کے عہد میں لاہور اور ملتان کے حاکم بنے۔[۲۲] احمد یار خان یکتا لاہور میں پیدا ہوئے اور اپنے وقت کے نامور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔خطاطی اور مصوری کے ماہر تھے۔ان کے ہم عصر غلام علی آزاد بلگرامی کے بقول ان کا انتقال ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴ء) میں ہوا۔[۲۳] یکتا نے تین مثنویاں تخلیق کیں:

i۔ گلدستہ حسن

ii۔ جہاں آشوب (یہ اورنگ زیب عالمگیر کا مرثیہ ہے)

iii۔ مثنوی یکتا (یہ ہیر رانجھے کا قصہ ہے)

یکتا قصے کا آغاز حمد سے کرتے ہیں اور پھر پنجاب اور بالخصوص لاہور کی شان بیان کرتے ہیں۔ قصے کی کہانی ان کے ہم عصر فقیر اللہ آفرین سے ملتی جلتی ہے۔صرف چند مقامات پر کہانی میں کچھ فرق ہے جیسا کہ کیدو کی لگائی بجھائی کے بعد ہیر کے عزیز و اقارب رانجھے کو قید کر دیتے ہیں۔ ہیر کا باپ دونوں کی شادی کے لیے رضامند ہو جاتا ہے لیکن سیالوں کی لعن طعن کے ڈر سے ایسا کرنے سے باز رہتا ہے۔ ہیر اور رانجھا کی زندگی کے آخری ایام کے حوالے سے بھی یکتا نے نئی بات کی ہے۔اس کے بقول جب قاضی کے ہاں سے فیصلہ ہیر اور رانجھے کے حق میں آ جاتا ہے تو بھی سیال اور کھیڑے ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور انھیں مارتے پیٹتے ہیں تو حضرتِ خضرؑ ان کی مدد کو آتے ہیں اور انھیں مشکل سے نکالنے کے بعد کہیں اور جانے کا مشورہ دیتے ہیں:

لازم آنست کز چنین کشور

رخت بندید ہر دو جای دگر(۲۴)

ہیر اور رانجھا حضرت خضر کی بات مان کر نگر نگر پھرتے بغداد پہنچ جاتے ہیں اور زیارات کے لیے مکہ مدینہ بھی جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن شاعر کے بقول وہ ابدی حیات پا جاتے ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔

میر محمد مراد لایق جونپوری

یہ عالم گیر کے عہد میں ہوئے اور انھوں نے ۱۰۹۶ھ (۱۶۸۵ء) میں ''مثنوی ہیر و رانجھا'' لکھی جس میں ۱۶۰۰ اشعار ہیں۔(۲۵) میر محمد مراد کے بقول رانجھا بھائیوں میں سب سے چھوٹا یعنی آٹھویں نمبر پر تھا۔ بھائی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک رات رانجھا خواب میں ہیر کو دیکھتا ہے جو اسے اپنے پاس بلا رہی ہے۔ اگلی صبح بیدار ہوتے ہی رانجھا سفر آغاز کرتا ہے اور تین راتوں کی مسافت طے کر کے چیناب (دریائے چناب) کے کنارے پہنچ جاتا ہے۔ ملاح کی منت سماجت کر کے ہیر کے پلنگ پر محوِ استراحت ہو جاتا ہے۔ ہیر اپنے پلنگ پر کسی اجنبی کے سونے کی خبر سن کر آگ بگولا ہو جاتی ہے اور ملاح کی خوب پٹائی کرتی ہے۔ اس کے بعد رانجھے کی پٹائی کے لیے آگے بڑھ کر اس کے مونہہ سے کپڑا ہٹاتی ہے تو اس کے حسن کی تاب نہ لا کر بے سُدھ ہو کر گر جاتی ہے:

از دیدن آں جمال سادہ — ماند ند دو نر کسش کشادہ
از حیرت او بجا چناں ماند — گوي کہ تہ اندریں جہاں ماند
چوں خوردز عشق تیر بر دل — بسم اللہ نمود گشت بسمل
دل از برا و برفت بیروں — ہوش از سراو برخت بیروں
افتاد چونقش روی دیبا — در پہلوی آں جوان زیبا(۲۶)

ہیر کی سہیلیاں اس کے مونہہ پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لاتی ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد ہیر رانجھے کے تلووں کی مالش کرتی ہے تو وہ بھی جاگ اٹھتا ہے۔ اس نے ہیر کو خواب میں دیکھا ہوا تھا۔ سامنے پا کر خوش اور حیران ہو جاتا ہے۔ رانجھا بھینسوں کی دیکھ بھال کے لیے نوکر بن جاتا ہے۔ دونوں روزانہ رات کو ملتے ہیں۔ ہیر ساری رات رانجھے کے ساتھ گزار کر صبح ہونے سے پہلے گھر لوٹ جاتی ہے۔ کیدو کی مخبری سے پیار کا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ ہیر کی شادی کر دی جاتی ہے۔ سسرال جا کر ہیر بیمار ہو جاتی ہے اور شہدی (سہتی) کو ہمراز بنا کر ساری بات بتا دیتی ہے۔ وہ بھی عشق کے ہاتھوں ڈسی ہوئی تھی۔ اس نے کاتب کو بلوایا اور ہیر کی طرف سے رانجھے کو چٹھی لکھوائی اور اسے فوراً رنگ پور پہنچنے کے لیے کہا۔ رانجھا جو کہ ہیر کی شادی کے بعد اپنے آبائی گاؤں واپس چلا گیا تھا، چٹھی پا کر پھر سے جی اٹھا۔ وہ جوگی کے روپ میں رنگ پور پہنچا اور در در بھیک مانگتا ہیر کے گھر آن پہنچا۔ یہاں اس کی مڈبھیڑ شہدی (سہتی) سے ہو گئی اور معاملہ یہاں تک بڑھا کہ شہدی نے اس کا

کشکول توڑ دیا۔ رانجھے نے گاؤں سے باہر ایک جھونپڑی میں قیام کیا۔ ایک دن اتفاقاً اسی قاصد کا ادھر سے گزر ہوا جو چٹھی لے کر گیا تھا۔ اس نے رانجھے کو شناخت کر لیا اور جا کر شہدی کو بتا یا۔ شہدی اس سے ملی اور انھوں نے مستقبل کی حکمتِ عملی طے کی۔ وہ طے شدہ منصوبے کے تحت ہیر کو سیر کے بہانے باہر لے گئی۔ اس کے پاؤں میں کانٹا چبھو کر سانپ کے کاٹنے کا واویلا کیا۔ بہت دوا دارو ہوئے لیکن ہیر کو چنداں افاقہ نہ ہوا۔ بالآخر شہدی کے مشورے پر سب لوگ گئے اور منت سماجت سے رانجھے کو علاج کی غرض سے ساتھ لے آئے۔ اس نے ایک الگ تھلگ مکان میں ہیر کا علاج شروع کیا۔ شہدی ان کی رکھوالی کی غرض سے وہاں بیٹھی تھی۔ اس نے رانجھے کو اپنے محبوب مراد بلوچ کے بارے میں بتایا تو رانجھے نے کرامت کے ذریعے سینکڑوں میل دور سے مراد بلوچ کو بلوا لیا۔ وہ شہدی کو اونٹنی پر سوار کرا کے لے گیا۔ ہیر اور رانجھا بھی راتوں رات شاہِ عادل کے علاقے میں جا پہنچے۔ صبح جب یہ خبر عام ہوئی تو ان کا پیچھا کیا گیا۔ ہیر اور رانجھا دھر لیے گئے۔ معاملہ قاضی کی عدالت میں پہنچا۔ اس نے بیانات سن کر ہیر کو کھیڑوں کے حوالے کیا۔ ابھی وہ لوگ روانہ نہیں ہو پائے تھے کہ رانجھے کی بد دعا سے پورے شہر میں آگ بھڑک اٹھی۔ لوگوں نے بادشاہ کے سامنے دہائی دی تو اس نے ہیر کو رانجھے کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد ہیر نے تخت ہزارہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ دورانِ سفر تھل میں رانجھا بیمار ہوتا ہے اور خالقِ حقیقی سے جا ملتا ہے۔ ہیر بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کرتی اور گزر جاتی ہے۔ لوگ دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیتے ہیں۔

قمر الدین منت

قمر الدین منت ۱۷۴۴ء میں سونی پت میں پیدا ہوئے۔ جعفری سید تھے۔ ان کے آباء و اجداد مشہد سے آئے تھے۔ ''تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند'' میں ان کے بارے میں یہ جانکاری ملتی ہے:

> ''مشہدی الاصل اور جعفری سادات میں سے ہیں۔ سید ناصر الدین کے اخلاف سے ہیں۔ جن کا مزار سونی پت میں ہے۔ سونی پت میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ تفسیر و حدیث شاہ عبدالعزیز دہلوی سے پڑھی ان سے سلسلہ قرابت بھی تھا۔ مولانا محمد فخر الدین دہلوی سے بیعت کی۔ ۱۷۷۷ء میں لکھنؤ گئے اور شیعہ مذہب اختیار کیا۔ نواب آصف الدولہ والئی اودھ، حیدر بیگ خان نائب الریاست اور راجا مکیت رائے دیوان کی تعریف میں قصائد لکھے۔ مرشد آباد گئے اور نواب صاحب کی تعریف میں قصیدہ کہا۔ کلکتہ میں وارن ہیسٹنگز کا قصیدۂ مدحیہ لکھا اور خطاب ملک الشعرائی حاصل کیا۔ حیدر آباد پہنچے اور نواب نظام الملک آصف جاہ کی مدح سرائی کی۔ دس ہزار روپے صلہ ملا۔ وہاں سے لکھنؤ آئے۔ راجا مکیت رائے ان کے اخراجات کے کفیل بنے۔ کچھ عرصہ بعد کلکتہ گئے اور وہیں ۱۷۹۳ء میں فوت ہوئے۔''(۲۷)

اوپر کی معلومات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ فارسی کے روایتی قسم کے قصیدہ گو شعراء میں سے تھے۔ڈاکٹر محمد باقر ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میر قمر الدین منت اٹھارویں صدی میلادی کے اردو فارسی کے وہ کامیاب شاعر ہیں، جو ایک طرف ڈوبتے ہوئے دیسی سورج کی پرستش کر کے عزت و جاہ فراہم کرتے ہیں اور دوسری طرف چڑھتے ہوئے بدیشی آفتاب کی مدح سرائی کر کے مال و منال سے سرفراز ہوتے ہیں۔''(۲۸)

میر قمر الدین منت نے فارسی مثنوی میں ''قصہ ہیر و رانجھن'' ۱۷۸۳ء میں لکھا۔اس وقت وہ عمر کے چالیسویں سال میں تھے۔مثنوی کے آخر میں انھوں نے اس کا سنِ تصنیف کچھ یوں بیان کیا ہے:

خردش از سر بدیعہ بگفت
''قصۂ عشق ہیر و رانجھن'' گیر(۲۹)

ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں:

''اس حساب سے تاریخِ تصنیف ۱۱۹۷ قمری (مطابق ۱۷۸۳م) بنتی ہے۔ چونکہ منت کا سالِ وفات معین طور پر ۱۲۰۸ قمری (۱۷۹۳ میلادی) ہے، اور یہ بھی متعدد تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ ۴۹ سال کی عمر میں فوت ہوا، اس لیے قیاس کہتا ہے کہ مثنوی نظم کرتے ہوئے اس کی عمر کا چالیسواں سال غالباً شروع ہوا تھا۔''(۳۰)

منت نے ۱۱۳ اشعار میں حمد لکھی ہے، اس کے بعد نعت لکھی ہے اور پھر اپنی شعر گوئی کے حوالے سے بات کی ہے اور زمانہ میں ہنر کی بے قدری کا گلہ کیا ہے۔منت کے بقول انھوں نے یہ قصہ ممتاز الدولہ جانسن کی فرمائش پر لکھا۔رچرڈ جانسن ان کی شاعری کا مداح تھا۔اسی نے منت کو گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے سامنے پیش کیا تھا۔

منت نے قصے میں کچھ تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ان میں سے ایک بڑی تبدیلی یہ ہے کہ اس نے رانجھے کو ہزارہ کے رئیس کا اکلوتا بیٹا کہا ہے:

رئیسی بود آنجا جان ہمت ملک در سیرت و آدم بصورت
خدا دادش یکی فرزانہ فرزند بخوبی جملہ خوباں را خداوند(۳۱)

منت نے ہیر اور رانجھے کی پہلی ملاقات کا مقام بھی بدل دیا ہے۔رائج کہانی سے ہٹ کر انھوں نے دونوں کی پہلی ملاقات کشتی کی بجائے ہیر کے باپ چوچک کے باغ میں بیان کی ہے۔کئی کرداروں کے نام ہی گول کر دیے ہیں۔جیسے کیدو اور سہتی کے کردار قصے میں موجود تو ہیں لیکن ان کے نام نہیں بتائے گئے۔منت نے قصے کو سکھانت انجام دیا ہے۔قاضی ہیر کو

رانجھے کے حوالے کر دیتا ہے اور دونوں خوشیوں بھری زندگی گزارنا شروع کر دیتے ہیں۔

سندر داس آرام

سندر داس آرام نے، جو کہ آرام پنجابی کے نام سے بھی مشہور تھے، گلشنِ رازِ عشق و وفا المعروف ''مثنوی ہیر و رانجھن'' کے عنوان سے ۱۱۷۱ھ (۱۷۵۷ء) میں ہیر رانجھے کا قصہ نظم کیا۔ اس تخلیق کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ''مجھ کو اس مثنوی کی تصنیف کا خیال آیا تو میں نے دیکھا کہ استادانِ معنی آفرین نے ''طراحی طبع رنگین'' سے اصلی قصہ کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اتفاق سے ''عمدۃ الخوانین بلند مکان بخشندہ بیگ'' کی رفاقت میں مجھ کو قصبہ جھنگ سیال میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مجمع زیارت حوری نژادان پاک طنیت میں ''خواب استراحت بعین ہشیاری و بیدار دلی'' میسر ہوئی اور مجھے ہیر اور رانجھا خواب میں نظر آئے اور فرمائش اس مثنوی کے لکھنے کی مجھ سے کی۔ لاہور واپس آنے پر نواب سید جمیل الدین خان بہادر کی سرکار کی منشی گری کے زمانہ میں مَیں نے اس قصہ کو نظم کرنا شروع کیا اور یگانۂ آفاق قدوہ شعرا سید امیر بخش کی ترغیب و ارشاد سے چھ ماہ میں مثنوی قریب الختم ہوگئی۔ چند داستانیں باقی تھیں، وہ حافظ آباد میں غرہ جمادی الاولیٰ ۱۱۷۱ کو ختم ہوئیں۔''(۳۲)

سندر اور وارث شاہ کے قصہ تخلیق کرنے میں صرف نو ماہ کا وقفہ ہے۔ وارث اور سندر کی کہانی میں معمولی سا فرق ہے۔ لیکن یہ فرق بھی قصے کی روانی کو متاثر کرنے والا نہیں ہے۔ سندر کے ہاں ہیر اور رانجھا ایک دوسرے کو پہلی دفعہ خواب میں ہی دیکھتے ہیں۔ سندر نے ہیر اور رانجھا دونوں کے مدرسے میں پڑھنے کی بات کی ہے لیکن وارث شاہ کے ہاں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ سندر نے ہیر کے باپ کا نام مسلم بتایا ہے۔ ہیر اور رانجھے کی پہلی ملاقات میں ہی پانچ پیر دونوں کا نکاح پڑھا دیتے ہیں۔ کیدو پیار کا کھیل بگاڑتا ہے اور ہیر کے گھر والے اسے گھر میں قید کر دیتے ہیں۔ وہ ایک دو بار چوری رانجھے سے ملنے جاتی ہے اور دونوں کی پریم کہانی کے گلی گلی چرچے ہو جاتے ہیں۔ ہیر کے والدین نورنگ نامی شخص سے اس کی شادی کر دیتے ہیں۔ سندر نے بھی نکاح کے موقع پر قاضی کی ہیر کے ساتھ زبردستی والی بات بیان کی ہے۔ ہیر نکاح کے لیے رضامندی ظاہر نہیں کرتی لیکن قاضی زبردستی اس کا نکاح پڑھا دیتا ہے۔ رانجھا جہیز کے ساتھ جاتا ہے رنگ پور جا کر بھی ہیر سے میل ملاقات جاری رکھتا ہے۔ کھیڑے اس بات سے زچ ہوتے ہیں اور ہیر انعام وغیرہ دے کر رانجھے کو واپس بھیج دیتی ہے۔ پھر ہیر کے چٹھی لکھنے پر رانجھا جوگی بن کر واپس آتا ہے۔ اس سے آگے کی کہانی سندر اور واث شاہ کے ہاں بہت ملتی جلتی ہے۔ سندر نے یہ اضافہ کیا ہے کہ ہیر اور رانجھے کی وفات کے بعد بھی ایک حکایت قصے کے ساتھ جوڑی ہے جس کے مطابق پنجاب سے حج کے لیے گیا ایک حاجی جہاز خراب ہونے کی وجہ سے کسی ریگستان میں جا نکلتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ہیر اور رانجھے سے ہوتی ہے۔ آرام کے

بقول اس طرح کی حکایات ثابت کرتی ہیں کہ ہیر اور رانجھا زندہ ہیں۔آر۔سی۔ٹمپل نے بھی *The Legends of the Punjab* میں یہی حکایت بیان کی ہے۔(۳۳)

ان شعراء کے علاوہ فارسی نثر میں بھی قصہ ہیر رانجھا لکھا گیا۔اس میدان میں پہلا نام گورداس کھتری کا ہے۔ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں:

> ''منثور فارسی قصوں میں سب سے پہلا قصہ ہیر رانجھا کا میرے علم میں گورداس کھتری (قوم کوہلی) ساکن قصبہ سنکھترہ کا ہے۔تاریخِ تصنیف معلوم نہیں۔''(۳۴)

گورداس کھتری نے یہ قصہ دمودر کے پنجابی قصے کو بنیاد بنا کر لکھا جو اس نے بھیرہ کے رہنے والے راجا رام کھتری عرف گجرال سے سنا تھا۔

بعد میں اسی قصہ کو منسا رام خوشابی نے ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ء) میں نثری قالب میں منتقل کیا۔اس نے یہ ظاہر کیا کہ یہ قصہ ہیر رانجھا اس کی اپنی اختراع ہے اور اس نے اپنی تخلیقی صلاحیت پر اس کو خلق کیا۔

قصہ ہیر رانجھا اپنے آغاز سے ہی عوامی سطح پر مقبولیت کی سیڑھیاں چڑھنا شروع ہوا اور اب تک اس مقبولیت اور عوامی پذیرائی میں کوئی کمی نہیں آئی اور وقت کی گزران نے اس قصے کی مقبولیت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ بہت سے شعراء نے مختلف زبانوں میں اسے نظما یا اور کئی لکھاریوں نے اسے نثر میں بیان کیا۔اس کی کہانی کو بنیاد بنا کر برِعظیم کی کئی زبانوں میں فلمیں اور ڈرامے بنائے گئے۔پنجاب کے لوگوں کو اس قصے میں اپنی خواہشات، مشاغل اور رسم و رواج کی خالص تصویر ہمیشہ سے دکھائی دیتی رہی ہے۔شعراء نے اپنے فن کے جوہر دکھانے اور نام بنانے کے لیے اسے بار بار لکھا۔اکبر کے درباری شاعر گنگ بھٹ نے ۱۵۶۵ء میں اسے ہندی کبت میں لکھا۔(۳۵) گورو گوبند جی نے ''دسم گرنتھ'' میں اس کا ذکر کیا۔(۳۶)

ہم نے صرف ان شعراء کا ذکر کیا ہے جنھوں نے وارث شاہ سے قبل یہ قصہ لکھا۔وارث شاہ کے بعد بھی ہیر نگاری کی یہ روایت چلتی رہی اور پنجابی،(۳۷) اردو،(۳۸) انگریزی(۳۹) اور فارسی میں(۴۰) شعراء نے یہ قصہ لکھا۔

حواشی

(۱) فوجا سنگھ، *History of Punjab*، جلد سوم، (پٹیالہ: شعبۂ مطالعۂ تاریخِ پنجاب، پنجابی یونی ورسٹی، ۱۹۷۲ء)، ص ۳۷۳

(۲) حسن انوشہ (مرتبہ)، دانشنامۂ ادبِ فارسی، جلد چہارم (بخش یکم)، (تہران: وزارتِ فرہنگ و ارشاد اسلامی، ۱۳۷۵ھ)، ص ۴۰۴

(۳) ڈاکٹر محمد باقر، پنجابی قصے فارسی زبان میں، جلد دوم (لاہور: پنجابی ادبی اکیڈمی، ۱۹۶۰ء) ص ۴۲

(۴) ایضاً،ص ۴۴

(۵) دمودر،ہیر دمودر ،مرتب: محمد آصف خاں(لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،۱۹۸۶ء)ص ۱۹

(۶) ایضاً،ص۱۹

(۷) ڈاکٹر محمد باقر، پنجابی قصے فارسی زبان میں ،جلد اول(لاہور: پنجابی ادبی اکیڈمی، ۱۹۵۷ء)ص ۸۲

(۸) ایضاً،ص ۸۳

(۹) ڈاکٹر ظہور الدین احمد، شاعری مشمولہ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند، جلد چہارم، مرتب: پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی، (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء)،ص ۲۴۳

(۱۰) ڈاکٹر محمد باقر، جلد اول،محولہ بالا،ص ۱۰۸

(۱۱) ایضاً،ص۱۰۸

(۱۲) ایضاً،ص۱۱۶

(۱۳) بلال زبیری، جھنگ کی لوک کہانیاں، (جھنگ: جھنگ ادبی اکیڈمی،۱۹۷۵ء)،ص۲۶۔

(۱۴) ڈاکٹر محمد باقر، جلد اول،محولہ بالا،ص ۱۱۲

(۱۵) ایضاً،ص۱۱۱

(۱۶) سیّد فیاض محمود، سیّد وزیر الحسن عابدی (مرتبین)، تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند، جلد پنجم، (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء)،ص ۵۰

(۱۷) ڈاکٹر اعجاز احمد ندیم، پنجابی قصہ ہیر و رانجھا لکھنے والے فارسی شعراء کا مختصر تعارف، مشمولہ کھوج، لاہور، شمارہ ۳۲ا (۲۰۰۹ء)،ص ۱۴۹

(۱۸) ڈاکٹر اعجاز احمد ندیم، محولہ بالا،ص ۱۵۰

(۱۹) ڈاکٹر محمد باقر، جلد دوم،محولہ بالا،ص ۸۴

(۲۰) ایضاً، جلد اول،محولہ بالا،ص ۱۵۳

(۲۱) وارث شاہ، ہیر سید وارث شاہ، مرتبہ: شیخ عبدالعزیز (لاہور: پنجابی ادبی اکیڈمی، ۱۹۶۰ء)،ص ۷

(۲۲) حسن انوشہ (مرتبہ)، دانشنامہ ٔ ادبِ فارسی ،محولہ بالا،ص ۲۷۴۵

(۲۳) ڈاکٹر محمد باقر، جلد اول،محولہ بالا،ص ۱۶۱

(۲۴) ایضاً،ص ۱۶۴

(۲۵) ڈاکٹر اعجاز احمد ندیم، محولہ بالا،ص ۱۵۶

(۲۶) ڈاکٹر محمد باقر، جلد اول،محولہ بالا،ص ۱۰۳

(۲۷) سیّد فیاض محمود، سیّد وزیر الحسن عابدی (مرتبین)، تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند، جلد پنجم، محولہ بالا،ص ۶۰

(۲۸) ڈاکٹر محمد باقر، جلد دوم،محولہ بالا،ص ۷۱

(۲۹) ایضاً،ص ۷۷

(۳۰) ایضاً

(۳۱) ایضاً،ص ۸۰

(۳۲) ڈاکٹر محمد باقر، جلد اول، محولہ بالا، ص ۱۷۲

(۳۳) ٹیمپل، آر سی (Temple, R. C)، *The Legends of the Punjab*، جلد دوم، (نئی دہلی: روپا اینڈ کو، ۲۰۰۲ء)، ص ۲۱۰

(۳۴) ایضاً، محولہ بالا، ص ۱۶۸

(۳۵) محمد افضل خاں، ہیر رانجھا دا قصہ، وارث توں پہلاں تے پچھوں، مشمولہ پنج دریا، لاہور، شمارہ ۱۰۔۱۱۔۱۲، (۱۹۶۹ء)، ص ۳۵۹

(۳۶) انسائیکلوپیڈیا آف انڈین لٹریچر، جلد دوم، (دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۵ء، ۱۵۶۸)

(۳۷) افضل خاں، محولہ بالا، ص ۲۶۰

(۳۸) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۹۱۔۱۸۲

(۳۹) افضل خاں، محولہ بالا، ص ۳۵۹

(۴۰) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، محولہ بالا، ص ۱۸۲-۱۸۰

مآخذ:

(۱) احمد، ظہور الدین، ڈاکٹر، شاعری مشمولہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند، جلد چہارم، مرتبہ: بدخشانی، مقبول بیگ، پروفیسر لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء۔

(۲) انوشہ، حسن (مرتب)، دانشنامہ ہیٔ ادبِ فارسی، جلد چہارم (بخش سوم)، تہران: وزارتِ فرہنگ و ارشاد اسلامی، ۱۳۷۵ھ

(۳) باقر، محمد، ڈاکٹر، پنجابی قصے فارسی زبان میں، جلد اول، لاہور: پنجابی ادبی اکیڈمی، ۱۹۵۷ء

(۴) _____ جلد دوم، _____، ۱۹۶۰ء

(۵) ٹیمپل، آر سی (Temple, R. C)، *The Legends of the Punjab*، جلد دوم، نئی دہلی: روپا اینڈ کو، ۲۰۰۲ء

(۶) خاں، محمد افضل، ہیر رانجھا دا قصہ، وارث توں پہلاں تے پچھوں مشمولہ: پنج دریا، لاہور، شمارہ ۱۲، ۱۰۔۱۱، ۱۹۶۹ء

(۷) دمودر، ہیر دمودر، مرتبہ: خاں، محمد آصف، لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۶ء

(۸) زبیری، بلال، جھنگ کی لوک کہانیاں، جھنگ: جھنگ ادبی اکیڈمی، ۱۹۷۵ء

(۹) شاہ، وارث، ہیر سید وارث شاہ، مرتبہ: شیخ عبدالعزیز، لاہور: پنجابی ادبی اکیڈمی، ۱۹۶۰ء

(۱۰) نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

(۴) محمود، فیاض، سیّد و عابدی، وزیر الحسن، سیّد، تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند، جلد پنجم، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء

رسائل

(۱) ندیم، اعجاز احمد، ڈاکٹر، پنجابی قصہ ہیر و رانجھا لکھنے والے فارسی شعراء کا مختصر تعارف مشمولہ کھوج،

شمارہ ۱، ۳۲، لاہور: پنجاب یونی ورسٹی، ۲۰۰۹ء۔

انسائیکلوپیڈیا

(۱) انسائیکلوپیڈیا آف انڈین لٹریچر، جلد دوم، دہلی: ساہتیہ اکادمی، ۱۹۹۵ء